شرافت اور سادگی کے پیکر: ڈاکٹر شریف احمد

20 جون 2012 کو شام 3 بجے شعیب رضا فاطمی نے فون پر یہ منحوس خبر دی کہ شریف صاحب اب نہیں رہے۔ شعیب کی آواز مجھے ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ان سے بار بار پوچھا کیا؟.....کیا؟ انہوں نے ہر بار ایک ہی جواب دیا ''شریف صاحب اب نہیں رہے''۔ میں نے پھر پوچھا کون شریف صاحب؟ انہوں نے جواب دیا 'ارے بھائی اپنے شریف صاحب، آپ کے استاد۔ میں نے پھر پوچھا آپ کو یہ خبر کس نے دی؟ ارے بھائی اسی گلی میں میرا آفس ہے، جہاں ان کا گھر ہے۔ شاید میرا ذہن اس خبر کو سچ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس خبر سے میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ میں محو حیرت تھا، کئی بار دل میں آیا کہ فیروز صاحب سے بات کروں جو شریف صاحب کے دل اور گھر کے بے حد قریب رہتے ہیں، لیکن نہ جانے کیوں میرے ہاتھ پاؤں کی جنبش تھم سی گئی۔ شاید آہستہ آہستہ میں شعور سے لاشعور کی طرف بڑھنے لگا تھا اور استاد محترم ڈاکٹر شریف احمد سے وابستہ یادیں جسے مصروف ترین شب و روز کی گرد نے دندھلا دیا تھا، دھیرے دھیرے روشن ہونے لگیں اور ان سے وابستہ جانے کتنے واقعات کئی گھنٹوں تک آنکھوں میں پھرتے رہے، میں خاموش پتھر کی مورت کی طرح اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ شام تقریباً سات بجے گھر سے باہر نکل کر جوگرس پارک میں واک کرنے چلا گیا۔ سوچا یہیں اطمنان سے فیروز صاحب سے اپنے رنج و غم کا اظہار کروں گا تا کہ دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ لیکن فیروز صاحب کو جب فون لگایا تو بمشکل کچھ سکنڈ ہی انہوں نے بات کی۔ اس کے بعد وہ زار و قطار رونے لگے اور فون کا رسیور بغیر کچھ کہے رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب کو فون کر کے اس سانحہ کی خبر دی۔ کچھ دیر تک تو وہ بھی بالکل خاموش رہے۔ پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو ممبئی گئے ہوئے تھے۔ وہاں جانے سے دو روز پہلے ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ واپس آ کر وہ میری کتاب ''آشرم'' پر اپنی تفصیلی رائے دینے والے تھے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرّا نے لگی۔ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے نہ جانے ان کی اہلیہ کس حال میں ہیں۔ پتہ نہیں ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ شکیل الرحمٰن صاحب کے لیے بھی یہ خبر بے حد وحشت اثر تھی۔ پھر بھی انھوں نے شریف صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔ کہنے لگے کشمیر یونیورسٹی میں ہم دونوں ساتھ ساتھ تھے۔ بعد میں وہ دہلی یونیورسٹی آ گئے۔ لیکن اُس وقت سے آج تک ہمارے تعلقات بے حد اچھے تھے۔ ہم دونوں اکثر و بیشتر ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ وہ ایک سچے دوست اور ساتھی تھے۔ تھوڑی دیر بعد شریف صاحب کے ایک شاگرد اور راشٹریہ سہارا کے نامہ نگار اطہر صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے بھی اپنے رنج و غم کا اظہار کیا پھر کہا کہ 'روزنامہ راشٹریہ سہارا' کے لئے آپ کا ردّعمل چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ استاد محترم کے متعلق میں جتنا بھی کہوں وہ کم ہے۔ فی الحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ سراپا استاد تھے۔ ان کے رگ و پے میں شرافت اور اپنے شاگردوں اور دوستوں کے تئیں محبت کا جذبہ تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو صرف تعلیم ہی نہیں دیتے تھے بلکہ تربیت بھی کرتے تھے۔ ایسے استاد اس زمانے میں عنقا ہیں۔

دوسرے دن فیروز صاحب کو میں نے پھر فون کیا۔ اس وقت ان کے اندر بات کرنے کی سکت شاید پیدا ہو چکی تھی۔ انہوں نے غمگین لب و لہجے میں بتایا کہ موت نے ان کا پیچھا اسی دن سے شروع کر دیا تھا جس دن انہوں نے ممبئی جانے کا ارادہ کیا۔ ممبئی جانے سے ایک روز پہلے یعنی 21 مئی 2012 کو شریف

صاحب فیروز صاحب سے ملنے ان کے گھر گئے ہوئے تھے۔ بقول فیروز صاحب اس وقت وہ سفر کے لائق بالکل نہیں تھے۔اس لیے فیروز صاحب نے انہیں سفر کرنے سے منع بھی کیا تھا لیکن ممبئی جانے کا انہوں نے مکمل ارادہ کرلیا تھا کیوں کہ ہر حال میں انہیں اپنے بھانجے کی شادی کی تقریب میں شامل ہونا تھا۔تمام رشتہ داروں سے ملنا تھا اور سب کے ساتھ خوشیاں بانٹنی تھیں۔لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو پایا۔ٹرین ہی میں دل کا دورہ پڑا۔وقت اور حالات کی ستم ظریفی نے انہیں شادی کی تقریب کے بجائے ممبئی کے ناناوتی اسپتال میں پہنچا دیا۔کافی دنوں تک اسی اسپتال میں داخل رہے۔لیکن دن بدن ان کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔تھک ہار کر انہیں 31 مئی کو دہلی لایا گیا اور پرانی دہلی کے ایک اسپتال میں بھرتی کر دیا گیا۔پانچ جون کو ان کے دل کی بائی پاس سرجری ہوئی۔ان کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہونے لگی تھی۔ یہاں تک کہ 23 جون کو انہیں گھر بھی لایا گیا لیکن دوسرے ہی دن انہیں پھر اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔انتہائی نگہداشت یونٹ میں انہیں رکھا گیا۔مصنوعی آلہ (پیس میکر) بھی لگایا گیا لیکن 82 سالہ شریف صاحب موت کو شکست نہ دے سکے اور 20 جولائی (بروز جمعہ) کو تقریباً دوپہر کے ڈھائی بجے سب کو روتے بلکتے چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔خدا ان کو جنت الفردوس اور اہلِ خانہ، رشتہ داروں، شاگردوں اور دوستوں کو صبرِ جمیل عطا کرے۔آمین۔

نہ جانے پہلی اپریل 1930 کو سیارے اپنے مدار میں گردش کرتے ہوئے کس مقام پر تھے اور امروہے کی سرزمین سے کتنے ڈگری کے زاویے بنا رہے تھے جب شریف صاحب اس دنیا میں تشریف لائے اور شرافت، قناعت اور قلندری ان کی شخصیت میں شامل ہوگئی۔نہ جانے یہ ستاروں کے سازگار گردش کا کمال ہے یا اس پاک سرزمین کے صوفیوں، سنتوں اور بزگوں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ وہ علم و ہنر کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔اس شبھ گھڑی کو میر اسلام ،وہاں کے صوفیوں، ابدالوں اور بزگوں کو میر اسلام جنہوں نے استادِ محترم کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ان حالات اور اشخاص کا بھی میں شکر گزار ہوں جن کی وجہ سے شریف صاحب پہلے کرناٹک کالج، دھارواڑ پھر الفنسٹن کالج، ممبئی اور آخر میں شعبۂ اردو، جمّو و کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کی ملازمت ترک کر کے جنوری 1962 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آئے اور مجھے (88-1986) میں ان کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

استادِ محترم ڈاکٹر شریف صاحب سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں میرا داخلہ کافی تاخیر سے یعنی جولائی کے بجائے ستمبر میں ہوا تھا۔داخلے کے سلسلے میں میں شعبہ میں جاتا تھا اس لیے تمام اساتذہ کو شکل سے پہچانتا تھا لیکن نام سے واقف نہیں تھا۔داخلہ ہو جانے کے بعد جب کلاس میں جانے لگا تو تمام اساتذہ کو ان کے نام اور کمالات سے بھی واقف ہونے لگا۔میرے سینیر ساتھی بتایا کرتے تھے کہ اگر لکچرر بننا چاہتے ہو تو فلاں فلاں پروفیسروں سے تعلقات بہتر بناؤ اور ان کی ناک کے بال بن جاؤ کیوں کہ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ہندوستان کی ہر یونیورسٹی پروفیسران اور شعبہ کے صدور ان کی بات سنتے ہیں۔سیاست دانوں تک بھی ان کی پہنچ ہے۔لیکن اگر علم حاصل کرنا چاہتے ہو اور ایک اچھا انسان بننا چاہتے ہو تو ڈاکٹر مغیث الدین فریدی اور ڈاکٹر شریف احمد کی محبت اور قربت حاصل کرو۔اس وقت تک میں نے لکچرر بننے کا خواب نہیں دیکھا تھا۔میں تو صرف اردو ادب کا ایک سچا اور لائق طالب علم بننا چاہتا تھا اور اردو کی تہذیب اور مٹھاس کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا تھا۔دراصل میں اپنے گھر سے دہلی IAS کے امتحان کی تیاری کی غرض سے آیا اور اردو ایک اختیاری مضمون کے طور پر لینا چاہتا تھا۔اس لیے میں نے مغیث الدین فریدی اور شریف احمد صاحب کی صحبت اور قربت کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ان اساتذہ کی صحبت کا اثر مجھ پر ایسا پڑا کہ میں IAS کا امتحان بھول گیا اور رفتہ رفتہ میں اردو کے سانچے میں ڈھلتا چلا گیا۔آج میں جو کچھ ہوں انہیں اساتذہ کی بدولت ہوں۔

شریف صاحب ایک مثالی استاد تھے۔ان کی ہر ادا اور خاص کر ان کا انداز گفتگو، کلاس روم میں داخل ہونے، کلاس روم میں کھڑے ہونے اور اپنے طلبہ سے مخاطب ہونے کا انداز بالکل منفرد تھا۔کلاس روم میں آتے ہی پہلے وہ بتاتے تھے کہ اس سے پہلے کی کلاس میں انہوں نے کیا پڑھایا تھا اور اس وقت کس موضوع پر لکچر دینے والے ہیں۔ان کی Body Language سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں اور آج دن بھر پڑھائیں گے۔وہ جس موضوع پر لکچر دیتے تھے اس سے متعلق پہلے بے شمار سوالات قائم کرتے تھے۔مثلاً 'خطوط غالب' اگر پڑھانا ہے تو پوچھتے تھے کہ خط کیا ہے؟ مضمون

،انشائیہ اور خط میں کیا فرق ہے؟ خطوط تو ہم سب لکھتے ہیں لیکن ہمارے خطوط کیوں نہیں پڑھائے جاتے ہیں۔ غالب کے خطوط کیوں آپ کے کورس میں شامل کیئے گئے ہیں؟ اردو نثر کے ارتقا میں غالب کے خطوط کے اثرات کیا ہیں؟ غالب کی نثر اور فورٹ ولیم کالج کے زمانے کی نثر میں بنیادی فرق کیا ہے؟ کیا خطوط غالب اپنے دور کی تہذیب وتاریخ کا آئینہ ہے؟ غالب کے خطوط اور مولانا آزاد کے خطوط میں کیا فرق ہے؟ کیا غبار خاطر کے خطوط کو بھی خط کہا جاسکتا ہے؟ یا انہیں انشائیہ کہنا چاہئے؟ مولانا نے اپنے مضامین کو خط سے کیوں تعبیر کیا؟ اور ان مضامین کے مجموعہ کا نام غبارِ خاطر کیوں رکھا؟ کچھ اور کیوں نہیں رکھا۔ کیا ان کے مضامین پر رومانیت کا اثر ہے یا نہیں؟ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ Romanticism کسے کہتے ہیں؟ احمد نگر کے قلعہ کا نقشہ، اس کا جغرافیہ، اس کی دیوار کی اُونچائی، کھڑکیوں کی لمبائی چوڑائی کا ذکر ایسے کرتے تھے جیسے احمد نگر کے قلعہ میں مولانا آزاد نہیں بلکہ وہ خود قید تھے۔ کرشن چندر کے افسانوں کا تجزیہ ایسے دلکش انداز میں کرتے کہ گلمرگ اور تمام وادیٔ کشمیر کا منظر آنکھوں میں پھرنے لگتا۔ کبھی 'گرجن کی ایک شام' کا منظر اور وہاں کی برفیلی ہواؤں کی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا تو کبھی جگدیش اور زیتی کی لازوال محبت کی گرمی کا بھی احساس ہوتا۔ کبھی گرجن دیوتا کی خود غرضی پر تنقید کی نشتر سے وار کرنے کا دل چاہتا۔ کبھی 'بالکونی' کی اطالوی لڑکی 'میریا' کے پیانو کی آواز کانوں میں گونجتی۔ اسی طرح ''مہالکشمی کے پل'' کے قریب چال میں پھیلی ہوئی مختلف رنگوں کی ساڑیوں سے ان کو پہننے والی عورتوں کی سسکیاں اور چیخیں سنائی دینے لگتیں تھی۔ وہ کرشن چندر کے افسانوں کے متعلق ایسے نکات پیش کرتے تھے کہ ہم سب حیران رہ جاتے۔ مثلاً کس طرح ایک بڑا افسانہ نگار صرف ایک خاص فضا تیار کرتا ہے اور بغیر کسی مرکزی کردار کے افسانے کی تخلیق کر دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان کے لکچر ختم ہوتے ہوتے کرشن چندر افسانوی ادب کے تخت وتاج پر مسند نشیں نظر آنے لگتے تھے۔

شریف صاحب لکچرس کے دوران جس انداز سے سوالات قائم کرتے اس سے تمام طلبہ سوچ میں پڑ جاتے کہ آخر ان سوالوں کے جواب کیا ہیں؟ ہم سب پورے ارتکاز کے ساتھ ان کے لکچر کا ایسے انتظار کرنے لگتے جیسے سمندر میں سیپ سِواتی نچھتر کی بارش کی پہلی بوند کے انتظار میں اپنا منھ کھولے آسمان کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ جس طرح سِواتی کی پہلی بوند حاصل کرنے کے بعد سیپ موتی بن جاتی ہے۔ اسی طرح شریف صاحب کے لکچرس کے بعد کچھ دیر تک خود پر گوہر نایاب ہونے کا گمان ہونے لگتا۔ شریف صاحب کے لکچر دینے کا یہی انداز میں نے مختلف ادبی جلسوں اور سمیناروں کے خطبۂ صدارت میں دیکھا۔ ان کے بدن کے لسان سے معلوم ہوتا تھا کہ اس موضوع پر انہیں عبور حاصل ہے اور آج گھنٹوں تقریر کرنے والے ہیں۔ عام طور پر سمیناروں میں اجلاس کے آخری مقالہ سننے کے بعد سامعین باہر جانے کے لیے بے چین ہوجاتے ہیں لیکن شریف صاحب کی تقریر سننے کے لیے ہال میں سنّاٹا چھا جاتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ ہر طالب علم کی طرح میں بھی ان کی کلاس میں پابندی سے حاضر ہوتا تھا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد ان کے شاگرد ان کے پیچھے آتے اور وہ اکثر آرٹس فیکلٹی کی ٹی اسٹال یا Law فیکلٹی کی ٹی اسٹال پر سب کو چائے پلاتے تھے۔ میں اکثر ان کے ساتھ کبھی آرٹس فیکلٹی کے گیٹ تک تو کبھی پٹیل چیسٹ کے بس اسٹینڈ تک آتا تھا اور انہیں بس میں بیٹھا کر واپس آرٹس فیکلٹی یا اپنے ہوسٹل چلا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک بیگ رہتا تھا۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ بیگ ان کے ہاتھ سے لے لوں لیکن انہوں نے کبھی اپنا بیگ مجھے ڈھونے کے لیے نہیں دیا۔ وہ ہرگز خوشامد پسند استاد نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے طالب علموں سے تحقیر آمیز گفتگو نہیں کی وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں کو آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

شریف صاحب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ کتابیں پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ پڑھتے پڑھتے ان کی آنکھوں کی روشنی کم ہوگئی تھی۔ آنکھوں کی تکلیف سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ ایک دفعہ میں انہیں آنکھ کے ایک مشہور ڈاکٹر راجندر کھنّہ جو میرے ماموں کے کلاس فلّو ہیں، کے پاس لے گیا اور کہا کہ شریف صاحب میرے استاد ہیں۔ میرے اور میرے شعبہ کے ساتھیوں کی بھلائی کے لیے 'سر' کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہونی بے حد ضروری ہے۔ لہٰذا انہوں نے اچھی طرح معائینہ کرکے دوائیں دیں اور آنکھوں پر زور نہ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ لیکن شریف صاحب نے کبھی بھی اپنی آنکھوں کو آرام نہیں دیا۔ آرام دے بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ کتابیں تو ان کے لیے حیات بخش دوائیں تھیں۔ پڑھے بغیر وہ زندہ رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ مختلف لائبریریوں سے اپنی پسند کی

کتابیں حاصل کرتے تھے۔کبھی کبھی اپنے دوستوں اور شاگردوں سے بھی کتابیں مانگ کر پڑھتے تھے۔وہ چاہتے تو درجنوں کتابوں کے مصنف ہو جاتے لیکن انہوں اپنے علم کو شاگردوں میں منتقل کیا۔کسی فلسفی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ سچے اور لائق استادوں کے سینوں میں 'علم' مشعل کی طرح روشن رہتا ہے جس کی حرارت عقیدت مند شاگرد محسوس کرتے ہیں۔علم کا یہ مشعل آہستہ آہستہ عقیدت اور محبت کرنے والے شاگردوں کے سینوں کو منوّر کر دیتی ہے۔علاّمہ اقبال نے بھی کہا ہے''ایک بڑے استاد اور معلم کی حیثیت سورج کی طرح ہوتی ہے جو اپنی روشنی اور حرارت ہر شے تک بے کم وکاست پہچاتا ہے۔شریف صاحب نے بھی بلاتفریق کے اپنے شاگردں پر علم کی ضیافشانی کی۔شریف صاحب نے بھلے ہی کتابیں کم لکھی ہوں لیکن انہوں نے کئی اچھے اسکالرس، اچھے اساتذہ اور اچھے ناقدین پیدا کئے ہیں۔ایک لائق اور سچے استاد کی تخلیقات کتابیں نہیں بلکہ ان کے لائق شاگرد ہوتے ہیں۔علاّمہ اقبال ''سر'' کا خطاب قبول کرنے کے لیے شرط رکھی تھی کہ پہلے ان کے استاد مولوی میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دیا جائے۔انگریزوں نے علاّمہ سے پوچھا کہ آپ کے استاد کی تخلیقات کیا ہیں تو علاّمہ نے جواب دیا تھا کہ میرے استاد کی سب سے بڑی تخلیق میں خود ہوں۔شریف صاحب کی بھی تخلیقات ان کی کتابیں نہیں بلکہ دنیا بھر میں پھیلے ان کے شاگرد ہیں۔میں نے شریف صاحب کو ایک مصری طالب علم 'احمد محمد احمد عبدالرحمٰن القاضی' کو ذرّے سے آفتاب بناتے ہوئے دیکھا ہے۔1987 میں احمد قاضی دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں .M.A اردو میں داخلہ لیا تھا اب وہ الاظہر یونیورسٹی، قاہرہ میں پروفیسر ہیں۔مثالیں اور بھی ہیں لیکن اس وقت تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

شریف صاحب سے جڑے ہوئے واقعات اور میرے تئیں ان کی محبت وشفقت اور ان کی مہربانیوں کی داستان کافی لمبی ہے جن کی یاد مجھے اکثر آتی رہتی ہے۔اکتوبر 1986 کی ایک صبح جس نے میری زندگی بدل دی کی اکثر یاد آتی ہے۔تقریباً 9 بجے دہلی یونیورسٹی کی آرٹس فکلٹی کے مین گیٹ (جو سری رام کالج آف کامرس کے سامنے ہے) میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک Tea Stall تھا۔اسی ٹی اسٹال کے پاس کھڑا تھا کہ شریف صاحب کو خوبصورت سوٹ میں ملبوس آتے ہوئے دیکھا۔ان کے ہاتھ میں ایک کالے رنگ کا بیگ تھا جس کی چمک ان کے جوتے سے تھوڑی کم تھی۔جب وہ قریب آئے تو انہیں سلام کیا۔انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے بیگ کو دونوں ٹانگوں میں پھنسایا اور جیب سے ماچس اور سگریٹ کا ڈبہّ نکالا۔ماچس ان کے بائیں ہاتھ میں اور سگریٹ داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔اپنے ان دونوں انگلیوں کو بائیں ہاتھ پر ایسے ٹھوکنے لگے جیسے سگریٹ کی گرد جھاڑ رہے ہوں۔ماجس جلا کر سگریٹ سلگائی اور ایک کش لینے کے بعد بھاری آواز میں کہا''جناب آپ کی بہت تعریف ہو رہی تھی''۔دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں داخلہ لیے ہوئے مجھے ابھی صرف دو تین مہینے ہوئے تھے۔یونیورسٹی میں نہ مجھے کوئی جانتا تھا اور نہ میں کسی کو ٹھیک سے پہچانتا تھا۔اس لیے میں نے سوچا کہ شریف صاحب شاید مجھے پہچان نہیں رہے ہیں۔میں نے ان سے فوراً پوچھا''سر آپ مجھے پہچانتے ہیں''؟انہوں نے جواب دیا''ہاں میں آپ کو پہچانتا ہوں، آپ کا نام عقیل احمد ہے اور آپ کا تعلق بہار سے ہے''۔میں نے پھر پوچھا، سر! میری تعریف کہاں ہو رہی تھی؟انہوں نے جواب دیا، فریدی صاحب کے یہاں۔ان کے جواب سے میں مطمئن ہو گیا۔ان کی باتیں سن کر مجھے جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ یہ سوچ کر ڈر بھی لگنے لگا کہ اگر اپنے اساتذہ کی امیدوں پر کھرا نہیں اترا تو کیا ہوگا؟شریف صاحب کی یہ بات ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھی اور میں ان کے توقعات پر کھرا اترنے کی کوشش کرتا رہا۔

شریف صاحب بے حد شریف، مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔1990 میں نہ جانے کون سا مہینہ تھا میں M.Phil کا مقالہ لکھ چکا تھا اور جلد ہی .Ph.D میں رجسٹریشن کرانا تھا کیوں انٹرنیشنل ہوسٹل ٹھہرنے کی مدّت ختم ہو چکی تھی۔لیکن Ph.D میں رجسٹریشن کرانے کے لیے M.Phil کا رزلٹ جلد سے جلد آنا ضروری تھا۔میرے نگراں ڈاکٹر مغیث الدین فریدی فکرمند تھے کہ میرا مقالہ کسے بھیجا جائے کہ جلد از جلد Viva کرایا جا سکے۔میں نے انہیں پروفیسر ذاکر صاحب کا نام بتایا کیوں کہ انہوں نے ایک دفعہ دہلی یونیورسٹی کی سینٹرل ریفرنس لائبریری کے اردو سکشن میں کہا تھا''میاں اگر میری مدد کی کبھی ضرورت پڑے تو مجھے ضرور یاد کرنا۔فریدی صاحب نے یہ بات سن کر کہا''ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں''۔دوسرے دن فریدی صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم شریف صاحب کا شکریہ ادا کرو۔تمہارا مقالہ پروفیسر ذاکر صاحب کے پاس لے کر وہ خود گئے تھے اور Viva کی تاریخ بھی طے کر دی ہے۔چار دن بعد

تمہارا Vival ہے۔ میں شکریہ ادا کرنے کے لیے شریف صاحب کے پاس گیا تو وہ کہنے لگے شکریہ میرا نہیں فریدی صاحب کا ادا کیجئے۔ وہ آپ کے لیے بے حد پریشان تھے۔ یہ بات جب میں نے فریدی صاحب کو بتائی تو کہنے لگے مجھ سے کہیں زیادہ پریشان تو وہ خود تھے کہ تمہیں ہوسٹل میں دوبارہ داخلہ نہیں ملنے کی صورت میں تمہارا کیا ہوگا۔ دراصل پریشان میرے دونوں اساتذہ حضرات تھے لیکن وہ مجھ پر احسان جتانا نہیں چاہتے تھے۔ میرے یہ اساتذہ احسان کرتے تھے لیکن کسی کا احسان لیتے نہیں تھے۔ نیکی کرتے تھے اور دریا میں ڈال دیتے تھے۔ میں اس وقت بھی ان بزرگوں کا شکر گزار تھا، آج بھی ہوں اور آئندہ بھی رہوں گا۔ ایسی اور بھی باتیں ہیں جن کی یاد آتے ہی میرا سر ان کی تعظیم میں جھکنے لگتا ہے۔ وقت اور حالات نے اگر ساتھ دیا تو مستقبل میں تمام واقعات اور یادوں کو تفصیل سے لکھوں گا۔

شریف صاحب نے کبھی بھی اپنی قابلیت اور علمی فتوحات کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن ان کے تمام ساتھی اور طالب علم ان کی تمام صلاحیتوں سے واقف تھے اور اکثر و بیشتر ان کی تعریف کرتے رہتے تھے۔ شریف صاحب کو اردو زبان و ادب پر جتنا عبور حاصل تھا اتنا ہی فارسی اور انگریزی ادب پر بھی دسترس تھا۔ وہ موسیقی کے فن سے بھی واقف تھے اور کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کی محفل میں دلکش آواز میں غزلیں بھی سنایا کرتے ہیں۔ شریف صاحب کے انتقال کے فوراً بعد ان کے ایک پرانے شاگرد فیاض رفعت صاحب (جو پٹنہ دوردرشن کے ڈائرکٹر تھے۔ اب ملازمت سے سبک دوش ہو چکے ہیں) کا لکھنؤ سے فون آیا تھا۔ انہوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے شریف صاحب کی کئی خوبیوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ شریف صاحب کو اسٹیج ڈراموں سے کافی دلچسپی تھی اور وہ ایک اچھے اداکار بھی تھے۔ فیاض صاحب نے بتایا کہ 1969 میں پروفیسر محمد حسن نے غالب صدی کے موقع پر دہلی یونیورسٹی میں اپنا ہی لکھا ہوا ایک ڈرامہ ''غالب'' اسٹیج کیا تھا۔ اس ڈرامہ میں شریف صاحب نے فقیر کا رول ادا کیا تھا اور پُرسوز و پُرترنم آواز میں غالب کی ایک غزل گائی تھی۔ اس پروگرام میں فیاض رفعت موجود تھے۔

شعبۂ اردو کے تمام اساتذہ شریف صاحب سے محبت کرتے تھے اور شریف صاحب بھی ان حضرات سے ویسے ہی پیش آتے تھے لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ استادِ محترم ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور پروفیسر امیر عارفی سے وہ زیادہ قرب تھے۔ میں نے اکثر انہیں فریدی صاحب کے گھر (بی-13، ریڈس لائن) میں محوِ گفتگو دیکھا۔ میں بھی کبھی امیر عارفی صاحب کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا بھی کسی نہ کسی کام سے شریف صاحب کے پرانے گھر گلی کوچۂ رحمٰن، میں ان سے ملنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ ان کے گھر تک جانے والی تمام گلیاں تنگ تھیں۔ سائیکل، رکشا، ٹھیلا گاڑی اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم بی رہتا تھا۔ ان سب سے بچتے بچاتے ان گھر تک پہنچتا تھا۔ لیکن ان کے گھر پہنچ کر اور ان سے باتیں کرنے کے بعد خوشگوار اور فرحت بخش فضا میں بیٹھنے کا احساس ہونے لگتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوچۂ رحمٰن کی تنگ گلیوں سے گذر کر یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ خوشبودار پھولوں کے باغ سے ہو کر یہاں پہنچا ہوں۔ ان کے گھر کا زینہ کھڑا اور تنگ تھا۔ زینہ اکثر تاریک رہتا تھا لیکن شریف صاحب کے دل و دماغ کی روشنی اتنی تیز تھی کہ گلیوں کی تنگی اور زینہ کی تاریکی کا اثر آنے جانے والوں پر ہرگز نہیں پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا ڈرائنگ روم بہت چھوٹا تھا۔ ڈرائنگ روم میں موجود کتابوں کی تعداد سے اور بھی چھوٹا معلوم ہوتا تھا لیکن شریف صاحب کے دل کی وسعت اتنی زیادہ تھی کہ اس میں ان کے تمام شاگرد سما جاتے تھے۔ ان کی اہلیہ جنہیں میں آنٹی کہتا ہوں، ممتا کی مورت ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں چائے، بسکٹ اور نمکین لے آتیں اور بے حد محبت اور شفقت سے خیریت دریافت کرتیں، بالکل میری ماں کی طرح۔ شریف صاحب دوسرے اساتذہ کے مقابلے میں باتیں ذرا کم کرتے تھے پھر بھی کافی دیر تک ان سے گفتگو ہوتی رہتی تھی اور ان کے پاس سے جلد واپس آنے کا دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نئے گھر (دریا گنج) میں ان کے منتقل ہونے کے بعد میں بہت کم جاتا تھا کیوں کہ میں بھی یونیورسٹی کیمپس سے شپرا سن سٹی، غازی آباد چلا آیا اور فیملی مسائل میں مصروف ہو گیا لیکن فون پر اکثر و بیشتر ان سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ذاکر حسین کالج کے استاد ڈاکٹر فیروز دہلوی ان کے گھر کے بے حد قریب رہتے ہیں۔ شریف صاحب سے ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ فیروز صاحب میرے بھی استاد رہ چکے ہیں اور مجھ سے محبت کرتے ہیں اس لیے شریف صاحب کی خیریت سے مجھے ہمیشہ آگاہ کرتے رہتے تھے۔

شریف صاحب آج بھلے ہی ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کا فیض ابھی جاری ہے۔ میں جب بھی اپنے شاگردوں کو شاعری کی کلاس پڑھانے جاتا ہوں تو استادِ محترم مغیث الدین فریدی اور نثر یا افسانے کی کلاس لینے جاتا ہوں تو شریف صاحب میرے حواس پر چھانے لگتے ہیں۔ کلاس روم میں ان کے داخل ہونے، کھڑے ہونے اور لکچر دینے کا جو انداز تھا، وہ میرے آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ ان کے لکچرس مجھے یاد آنے لگتے ہیں اور میں انہیں کے لکچرس انہیں کے انداز میں دینے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ فریدی صاحب اور شریف صاحب میں ہی ہوں اور میں ستیہ وتی کالج کے کلاس روم میں (.B.A(Hon کے طلبا کو نہیں بلکہ دہلی یونیورسٹی کے آرٹس فیکلٹی میں M.A (اردو) کے طلبہ کو پڑھا رہا ہوں۔ مجھے وقت کا خیال نہیں رہتا ہے۔ کئی دفعہ دوسرے کلاس کے بچے جب آ کر کہتے ہیں کہ ''سر! آپ کے ساتھ ہماری کلاس ہے'' تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں 'میں' ہوں، شریف صاحب یا فریدی صاحب نہیں۔ شعبہ کے میرے ایک ساتھی (ڈاکٹر ساجد حسین جو آج کل دیال سنگھ کالج میں ہیں) ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کس کتاب کو پڑھ کر لکچر دیتے ہیں تو میں نے فخر سے کہا تھا کہ میں کتاب پڑھ کر لکچر نہیں دیتا ہوں۔ یہ تو میرے استادوں کا کمال ہے کہ ان کے لکچرس آج تک میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ میں جب بھی کلاس پڑھانے جاتا ہوں تو ان کے لکچرس جو میرے دماغ کے Memory Chips میں محفوظ ہیں Activate ہو جاتے ہیں اور لکچر کے دوران خود بخود دورِ زباں ہونے لگتے ہیں۔

شریف صاحب ہمیشہ میری ہمت افزائی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ عقیل آپ سے ہمیں بہت امیدیں ہیں۔ ان کا یہ جملہ سن کر میں ڈر جاتا تھا۔ 1988 میں M.A, فائینل کا امتحان دیا اور دہلی یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ دہلی یونیورسٹی میں سب سے زیادہ میڈل، گولڈ میڈل اور پرائز حاصل کرنے والوں میں میرا نمبر دوسرا تھا۔ مجھے لگا کہ شریف صاحب کی امیدوں پر میں کھرا اُتر چکا ہوں۔ شام میں ان سے ملنے کے لئے اپنے تمام میڈلس کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور بہت دعائیں دیں۔ جب ان کے گھر سے واپس آنے لگا تو انہوں نے علامہ اقبال کا یہ شعر

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

سنایا۔ مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا اور سمجھ گیا کہ ان کی امیدوں پر کھرا اُترنا ابھی باقی ہے۔ میں نے دہلی یونیورسٹی سے ایم. فل. اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی اور ستیہ وتی کالج میں لکچرر بھی ہو گیا لیکن شریف صاحب ہمیشہ یہ کہتے رہے ''عقیل تم سے مجھے بہت امیدیں ہیں'' اور تھوڑی دیر کے لیے فکرمند ہو جاتا تھا۔ فریدی صاحب کے انتقال کے بعد نومبر 2001 میں میرا ایک مضمون ''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے'' ماہنامہ 'ایوان اردو' میں شائع ہوا۔ استادِ محترم فیروز دہلوی نے کہا کہ تمہارا مضمون شریف صاحب کو بہت پسند آیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ ''عقیل کو اب ہماری اصلاح کی ضرورت نہیں ہے''۔ شریف صاحب کا تبصرہ سن کر مجھے خوشی ہوئی لیکن اس وقت تک ان کی امیدوں پر میں کھرا نہیں اُترا تھا۔ اس کے بعد میری کئی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے جنہیں پڑھ کر انہوں نے میری ہمت افزائی کی۔ 2010 میں استادِ محترم مغیث الدین فریدی کی شخصیت اور شاعری پر میری ایک کتاب ''مغیث الدین فریدی کا تخلیقی کینوس'' شائع ہوئی۔ شریف صاحب کی خدمت میں جب یہ کتاب میں نے پیش کی تو بے حد خوش ہوئے۔ کہنے لگے 'عقیل تم نے حقِ شاگردی ادا کر دیا۔ تم سے مجھے یہی امید تھی۔ کتاب پڑھنے کے بعد بھی انہوں نے فون کیا اور اس کتاب کے سلسلے میں جو تبصرے کیے اسے سن کر میں خوشی سے رو پڑا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں ان کی امیدوں پر اب کھرا اُتر چکا ہوں۔ شریف صاحب کے انتقال سے چند مہینے پہلے فیروز صاحب نے مجھے فون کیا اور پوچھا کہ کیا پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اپنی کوئی کتاب تمہارے نام منسوب کی ہے؟ میں نے 'جی سر!' کہتے ہوئے پوچھا آپ کو کس نے بتایا؟ انہوں نے کہا کہ شریف صاحب نے۔ شریف صاحب کا نام سن کر میرے دل میں ان کا ردِعمل سننے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ لہٰذا فیروز صاحب سے بات ختم کرنے کے فوراً بعد شریف صاحب کو فون کیا اور ان کی خیریت دریافت کی اسی درمیان انہوں نے کہا کہ شکیل الرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب ''محمد دارا شکوہ'' آپ کے نام معنون کیا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟ میں نے کہا 'جی سر!'۔ انہوں نے پھر پوچھا ''شکیل الرحمٰن صاحب نے آپ کے متعلق

جو Comment لکھا ہے کیا آپ نے اسے پڑھا؟ میں نے پھر کہا 'جی سر!'۔اس کے بعد شریف صاحب نے کہا ''جناب یہ بہت بڑی بات ہے''۔ان کی باتیں سن کر میں خود پر فخر محسوس کر رہا تھا لیکن میں نے ان سے کہا کہ 'سر! شکیل الرحمٰن صاحب نے میرے نام اپنی کتاب کا جو انتساب کیا ہے اور جو کچھ میرے بارے میں لکھا ہے اس کے لائق میں نہیں ہوں۔انہوں نے تو صرف محبت میں لکھا ہے۔شریف صاحب نے پھر کہا، ''نہیں میں بھی ان کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں''۔شریف صاحب سے یہ میری آخری ٹیلی فونک گفتگو تھی۔کاش وہ آج زندہ ہوتے اور میں انہیں غالب کا یہ شعر سناتا:

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت، گیا اور بود، تھا

اور ان سے گزارش کرتا کہ سر! آپ میری تعریف مت کیجئے آپ تو صرف یہی کہتے رہئے کہ عقیل تم سے مجھے بہت امیدیں ہیں اور اقبال کا وہ مصرع بھی مجھے یاد دلاتے رہئے کہ ''ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔''

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad